فصل دہم

(۱)

نیاز کو بیوی کے انشورنس کا روپیہ ملا تو اس کے دن پھر گئے۔ پچاس ہزار وصول کرنے کے کچھ بعد اس نے مضافات میں ایک کوٹھی خریدلی اور پرانا مکان چھوڑ کر اس میں منتقل ہو گیا۔

یہ خاصا اجاڑ علاقہ تھا۔ مشرق میں اونچے نیچے بنجر ٹیلے تھے، قرب وجوار میں چند پرانی وضع کے مکان جن میں کبھی فوجی افسروں کی رہائش تھی۔ مگر جب سے یہ بنگلے عام شہریوں کے تصرّف میں آئے تھے اس وقت سے روز بروز نت نئی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن شام ہوتے ہی ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ راستوں پر آمد و رفت کم ہو جاتی۔ پہر رات گزرنے کے بعد سارا علاقہ قبرستان کی طرح معلوم ہوتا۔ اندھیرا ہوتے ہی گیدڑ بولنا شروع کر دیتے۔ رات کے سناٹے میں ان کی آوازیں بھیانک لگتیں۔

کوٹھی میں چار کمرے تھے۔ نیاز نے نیلام میں خریدے ہوئے فرنیچر سے تمام کمروں کو خاصا سجا لیا تھا۔ کوٹھی میں بڑا سا احاطہ تھا جس میں گھنے درخت تھے۔ عرصے سے باغیچے کی دیکھ بھال نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا ہر طرف جھاڑ جھنکاڑ نظر آتے۔ رات کے وقت شاخوں سے خشک پتے ٹوٹ کر گرتے۔ ایسا معلوم ہوتا کوئی دبے قدموں درختوں تلے چل رہا ہے۔

کوٹھی میں آ کر نیاز کو ہر طرح کی آسائش مل گئی تھی۔ مگر آمد و رفت کی بڑی تکلیف تھی۔ دفتر کا شہر میں تھا۔ سویرے ہی سویرے وہ گھر سے نکل جاتا۔ مگر بس کے انتظار میں کبھی کبھی

کبھی کم ہونا، ایسے دن آنا۔ مضافات: قرب و جوار۔ وضع: انداز۔ تصرف: استعمال۔ ہو کا عالم: خاموشی، ویرانی۔

تو گھنٹوں انتظار کرنا پڑا۔ صرف چند بسیں اس راستے پر چلتی تھیں۔ وہ بھی پرانی کھٹارا تھیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بس خراب ہو جاتی۔ اس پریشانی کا حل اس نے یہ نکالا کہ ساڑھے چھ ہزار میں ایک کار خرید لی۔ یہ سرخ رنگ کی ٹوسیٹر سنگر تھی۔ پرانا ماڈل تھا مگر کنڈیشن اچھی تھی۔

کار خریدنے کے ساتھ ہی نیاز کے پر لگ گئے۔ اس نے شلوار اور قمیص چھوڑ کر پتلون اور بُش شرٹ پہننا شروع کر دی۔ مونچھیں صفاچٹ کرا دیں اور ٹوسیٹر میں ٹھاٹھ سے بیٹھ کر اڑا اڑا پھرتا۔ دکان بھی اس نے ختم کر دی اور ایک روز اس کی کوٹھی پر پلاسٹک کی بنی ہوئی تختی بھی لگ گئی جس پر انگریزی حروف میں لکھا تھا:

شیخ محمد نیاز، گورنمنٹ کنٹریکٹر

ویسے وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی نہ جانتا تھا۔ مگر گورنمنٹ کنٹریکٹر ضرور ہو گیا تھا۔ اس کو ڈیلیوڈی کی نئی بیرکوں کی تعمیر کا ٹھیکہ مل گیا تھا۔ کام بڑا نہیں تھا لیکن بی کلاس گورنمنٹ کنٹریکٹر کی حیثیت سے اس کا نام ٹھیکے داروں کی فہرست میں رجسٹرڈ ہو گیا۔ اسی ٹھیکے کے بل بوتے پر اسے میونسپلٹی کے نئے مارکیٹ کی تعمیر کا ٹھیکہ بھی مل گیا۔ اس کا ٹینڈر سات لاکھ کا تھا۔ دوسرے کنٹریکٹروں کے ٹینڈر کم تھے۔ مگر خان بہادر فرزند علی انہی دنوں نیا نیا میونسپلٹی کا چیئرمین بنا تھا الیکشن پر اس کا بہت روپیہ صرف ہوا تھا لہٰذا وہ ان دنوں زیادہ سے زیادہ کمائی کی فکر میں تھا۔ نیاز اس کے مراسم بھی تھے۔ اس نے ۳۳ فیصد حصہ رکھ کر نیاز کا ٹینڈر منظور کرا دیا۔

نیاز کو تعمیرات کے کام کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کے پاس اتنے بڑے کنٹریکٹ کے لیے سرمایہ تھا۔ لہٰذا اس نے ساڑھے چار لاکھ روپے میں سارا کام چھوٹے ٹھیکیدار کو دے دیا۔ اب اس کام میں اس کی دلچسپی صرف اس قدر رہ گئی تھی کہ ٹھیکے کے نام پر اس نے سیمنٹ اور لوہا جو فاضل کوٹا منظور کرایا تھا اسے بلیک مارکیٹ میں کس طرح فروخت کیا جائے۔

خان بہادر فرزند علی سے اس کے تعلقات پہلے ہی اچھے تھے۔ اس ٹھیکے کی وجہ سے دونوں کے تعلقات اور بھی گہرے ہو گئے۔ نیاز کا بیشتر وقت خان بہادر ہی کے ساتھ گزرتا۔ خان بہادر کی توسط سے شہر کے اعلیٰ حکام تک اس کی رسائی ہو گئی۔ رفتہ رفتہ وہ ایک معزز شہری بنتا جا رہا تھا۔ تقریباً ہر شب خان بہادر کے یہاں اس کی نشست ہوتی۔ اس محفل میں شراب کا دور

پر لگنا: مچی مارنا۔ صفاچٹ: بالکل صاف۔ بل بوتا: زور، طاقت۔ فاضل: فالتو۔ کوٹا: حصہ۔ رسائی ہونا: تعلق / پہنچ ہونا۔

ج اور رمی ہوتی۔ خان بہادر کو رمی کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ میونسپلٹی کا چیئرمین منتخب ہونے
اس کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ مگر رمی کے پروگرام میں فرق نہ آیا۔
رات ہوتے ہی کچھ سرکاری افسر اور شہر کے بعض بڑے تاجر اس کی کوٹھی پر اکٹھا ہوتے اور
کا شغل شروع ہو جاتا۔ اس طرح خان بہادر کی کوٹھی پرائیویٹ قسم کا کلب بن گئی تھی جس
کی نیاز بھی تھا۔ شروع شروع میں وہ پینے پلانے کے شغل سے کتراتا رہا۔ مگر کب تک بچتا۔
سب نے اصرار کر کے زبردستی تھوڑی سی اسکاچ وہسکی پلادی۔ یہ گویا ابتدا تھی۔
اس کے بعد تو وہ لہک لہک کر پینے لگا۔
نیاز کی زندگی بڑے ٹھاٹھ سے بسر ہو رہی تھی۔ سلطانہ اور انو اس کے ساتھ ہی کوٹھی میں
تھے۔ دونوں جاتے بھی کہاں۔ ان کا بیٹھا ہی کون تھا جو سرپرستی کرتا۔ مگر نیاز کا رویہ سلطانہ کے
بالکل مختلف تھا۔ سلطانہ کی ماں کو مرے ہوئے کئی ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ مگر اس تمام عرصے میں نہ
نے اس کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی اور نہ کسی ایسی بات کا موقع دیا، جس سے اس کی دل
ہوتی۔
وہ عام طور پر سویرے ہی سویرے کار لے کر کوٹھی سے نکل جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ ایسا
ہوا کہ رات کو واپسی کے بعد اس نے سلطانہ سے کوئی بات چیت کی ہو۔ وہ چپ چاپ جا کر
میں سو جاتا۔ رات کا کھانا وہ خان بہادر ہی کے ساتھ کھاتا تھا۔ شروع شروع میں نیاز کا کھانا
اس کے کمرے میں رکھوا دیتی۔ مگر جب نیاز نے خود ہی منع کر دیا تو اس نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔
نیاز کی صحت بھی اب اچھی ہو گئی تھی۔ دکان پر دن بھر بیٹھے رہنے سے اس کے جسم میں جو
آ گیا تھا، دوڑ بھاگ سے کم ہو گیا۔ اس کی رنگت نکھر گئی تھی۔ شراب پینے سے رخساروں پر
سرخی جھلکتی رہتی۔ وہ جب نائیلون کی بش شرٹ اور پتلون پہن کر گھر سے بن سنور کر نکلتا
اکثر لگتا۔
ایک بار تو سلطانہ نے بھی اسے دیکھ کر سوچا تھا کہ نیاز روز بروز خوش شکل اور وجیہہ ہوتا

❀ ❀ ❀

کڑے کھٹ کھیل۔ دل آزاری: دل دکھنا، تکلیف۔ خوش شکل، وجیہہ: خوبصورت۔

گرمیوں کی خوشگوار شام تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ مغرب میں گہری نارنجی روشنی پھیلی تھی۔ درختوں کے طویل سائے خوابوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ سامنے سڑک پر اونٹوں کا ایک کارواں گزر رہا تھا۔ ان کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیاں شام کے سناٹے میں آہستہ آہستہ بج رہی تھیں۔ سلطانہ اپنے کمرے کی کھڑکی پر کھڑی تھی۔ یہ کھڑکی باہر باغیچے میں کھلتی تھی۔ گھنٹیوں کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ آفتاب کی نارنجی شعاعیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔

سامنے ایک درخت کے پاس نیاز کھڑا تھا۔ اس وقت وہ کہیں جانے کی غرض سے نکلا تھا۔ ڈرائیور اسٹپنی کا پنکچر جڑوانے کے لیے کار لے گیا تھا۔ وہ اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی لالہ گوں روشنی میں وہ خاصا دیدہ زیب نظر آ رہا تھا۔ سلطانہ نے اسے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ عین اسی وقت نیاز نے اس کی جانب نظریں اٹھائیں۔ لمحہ بھر کے لیے دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا۔

سلطانہ فوراً ہٹ گئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ لیکن اس واقعے کے بعد بھی نیاز کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

اتوار کو نیاز عموماً گھر پر رہتا۔ مگر اس کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزرتا یا پھر ملنے جلنے والے آ جاتے۔ وہ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا باتیں کرتا رہتا۔ سلطانہ سے اس کی بات چیت بہت سرسری ہوتی۔ کئی بار وہ اسے اور آنو کو کار میں بٹھا کر شاپنگ کے لیے شہر بھی لے گیا اور ہمیشہ سامان سے لدا پھندا لوٹا۔ اس کے سامان میں زیادہ تر سلطانہ کے بنڈل ہوتے۔

وہ اس کے ساتھ بڑی نرمی اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتا۔ بات کرتا تو عام طور پر نظریں جھکی ہوتیں۔ یہ گفتگو عام طور پر رسمی سی ہوتی تھی۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوتا جب وہ اس سے کوئی ذاتی سوال کرتا وہ بھی کچھ اس قسم کا ہوتا۔

"تمہارا دل تو یہاں نہیں گھبراتا؟"

"رات تمہاری کھانسی سنائی دے رہی تھی۔ جا کر ڈاکٹر کو دکھا دو!"

"کسی بات کی تکلیف تو نہیں؟"

گھریلو اخراجات کے لیے وہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو سویرے ہی سویرے آنو کو بلاتا اور اس کے ذریعے سلطانہ کو تین سو روپے بھجوا دیتا۔ بجلی کا بل، نوکروں کی تنخواہ اور کپڑوں کی دھلائی وہ خود ادا

خلط بڑے مزے میں گزر بسر ہو رہی تھی۔ اس آسائش نے ماں کا غم دھندلا کر دیا تھا۔ سلطانہ کا
پ بے پناہ ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں برسات کی شاموں کا حسن ہوتا اور جسم پھولوں سے لدی
ٹنی طرح لچکتا۔ اس کے حسن میں نرالی سج دھج آ گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

سلطانہ کے ساتھ نیاز کا رویّہ جتنا نرم اور معقول تھا اسی قدر وہ انّو کے ساتھ بے رخی سے پیش
ت بات بات پر اسے ڈانٹتا ڈپٹتا۔ زیادہ ناراض ہوتا تو گالیاں دینے سے بھی نہ چوکتا۔ دو بار انّو کے منہ
ں نے تھپڑ بھی مارے تھے اور ایک دفعہ تو ایسا غضب ناک ہو گیا کہ پانی کا گلاس کھینچ مارا۔ مگر انّو
چ گیا۔ شیشے کا گلاس دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔

انّو ڈرا سہما رہتا تھا۔ نیاز کے جارحانہ رویّے نے اسے اور خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت چپ
رہتا اور اس کمسنی میں بڑے بوڑھوں کی طرح سنجیدہ نظر آتا۔ نیاز گھر میں آتا تو انّو کی یہی
ش ہوتی کہ اس کے سامنے نہ جائے۔ اگر نیاز کسی کام سے بلاتا تو اس کا چہرہ زرد پڑ جاتا۔ وہ سہما ہوا
ا کر لیا اس کے پاس جا کر خاموش کھڑا ہو جاتا۔ وہ کسی کام کو کہتا تو بدحواسی میں کوئی نہ کوئی الٹی
ی حرکت سرزد ہو جاتی۔ نیاز پاگل کتے کی طرح دانت کچکچا کے اس کی جانب لپکتا اور گالیوں کی
ار کر دیتا۔

انّو کے ساتھ نیاز کے اس نارواروّیے کو سلطانہ نہ بارہا شدت سے محسوس کر چکی تھی۔ مگر کبھی
ا کرنے کی اسے جرأت نہ ہوئی۔ ایک بار جب نیاز نے انّو کے منہ پر تھپڑ مارا اور وہ روتا ہوا اس
ہاں آیا تو وہ بے چین ہو گئی۔ انّو کے رخسار پر انگلیوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ سسکیاں
لے بے چارگی سے رو رہا تھا۔ سلطانہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تو اپنی بے کسی پر خود اس کی
گھگھی بندھ پڑیں۔ وہ انّو کو سینے سے لگا کر بے اختیار رونے لگی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرے بھائی صبر کر۔ اللہ کے لیے اس طرح بلک بلک کر نہ رو۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔"

اسے سینے سے لگائے وہ دیر تک ہچکیاں لے کر روتی رہی۔

انّو اسے بچپن ہی سے بڑی محبت تھی۔ اور اب تو بھری دنیا میں وہ اس کا واحد سہارا رہ گیا
سلطانہ کے ابّا اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایک بھائی ایسا گیا کہ یہ بھی خبر نہ ملی کہ زندہ ہے یا مر گیا۔

انّو کے ساتھ نیاز کا رویہ روز بروز سخت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اسے خواہ مخواہ ایذا پہنچانے کی

کو شش کرتا۔

اس کا کام کاج کرنے کے لیے گھر میں ملازم موجود تھا۔ مگر وہ اپنا سارا کام ادبدا کر انو ہی کراتا۔ ذرا سی غلطی پر گندی گندی گالیاں دیتا۔ اس کے چہرے پر تھوک دیتا۔ بازو پکڑ کر پن چبھو تکلیف سے بلبلا کر چیختا تو بے رحمی سے مارتا۔

انو نے بارہا سلطانہ سے فریاد کی۔ وہ اسے دلاسا دے کر رہ جاتی۔ نیاز سے کچھ کہنے کی کبھی ہمت ہوئی پھر ایک ایسا وقت آیا کہ انو نے نیاز کے خلاف کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ چپ چاپ اس کی مار سہ اور گھر کے کسی گوشے میں جا کر چپکے چپکے روتا۔ نیاز سے تو اسے چڑ تھی ہی اب وہ سلطانہ سے بھی بیزار رہنے لگا۔ اسے تنہائی سے رغبت ہوتی جا رہی تھی۔ جب دیکھو اکیلا بیٹھا ہے۔ اس وقت وہ بڑی لمبی پٹانگ باتیں سوچا کرتا۔ اس کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ جسم کے ہر ہر جوڑ کی ہڈیاں نکل آئیں تھیں۔

اس مریل سے لڑکے سے نیاز کو نہ معلوم کیوں اس قدر بیر تھا کہ دیکھتے ہی جھنجلا جا آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ ہونٹ کانپنے لگتے۔ اسے اذیت پہنچا کر اسے عجیب سی تسکین ملتی۔

انو اس کے سامنے جاتا تو اس طرح گھگیا کر بولتا کہ خارش زدہ کتے کی طرح حقیر نظر آتا۔ نفرت کی بنیادی وجہ کسی حد تک خود سلطانہ تھی۔ اسے انو سے بے تحاشا پیار تھا۔ اس کا زیادہ تر اس کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔ وہ اسے اپنے سامنے بٹھا کر ناشتا کراتی۔ اصرار کر کے کھانا کھلاتی اپنے کمرے ہی میں اسے سلاتی تھی۔ کبھی بیٹھی اس کے کپڑوں میں بٹن ٹانک رہی ہے۔ اس کی کتا قرینے سے لگا رہی ہے۔ اس کے جوتوں پر پالش کر رہی ہے۔ اس کا بستر درست کر رہی ہے۔

وہ سویرے بہت تڑکے اٹھ جاتی اور دیر تک انو کو بیدار کرتی رہتی۔ وہ اس وقت گہری نیند ہوتا۔ بار بار کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیتا۔ مگر ناراض ہونے کے بجائے وہ اسے چمکارتی رہ آخر جب اٹھ کر بیٹھ جاتا تو اسے غسل خانے میں لے جاتی۔ جب تک وہ نہاتا رہتا عام طور پر دروازے پر کھڑی بے چینی سے اس کا انتظار کرتی رہتی۔ کنگھا لے کر اس کے بال بناتی۔ ذرا دیر اس کے لیے گرم گرم دودھ کا گلاس لے کر آتی اور زبردستی پورا گلاس پلاتی۔ اسکول جاتا تو کبھی دروازے پر کھڑی دور تک اسے دیکھتی رہتی۔

سلطانہ نے اپنی ساری توجہ کا مرکز انو کو بنا لیا تھا۔ نیاز کبھی کبھار اس کے کمرے کے سا

ادبدا کر: جان بوجھ کر۔ بیر: دشمنی۔ تسکین: راحت، تسلی۔ چمکارتی: پیار کرتی۔

دیکھتا کہ وہ انّو کا کوئی نہ کوئی کام کر رہی ہے۔ وہ اس قدر منہمک ہوتی کہ نیاز کی جانب نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔

انّو کی عزلت پسندی نے سلطانہ کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اسے کبھی باغیچے کے گھنے درختوں کے نیچے سے کبھی باورچی خانے کی کوٹھری سے، کبھی چھت پر جانے والے زینے سے بڑھ ڈھونڈھ کر لاتی۔ مگر انّو اس کی نظر بچتے ہی کہیں نہ کہیں چھپ کر بیٹھ جاتا۔ وہ گھبرائی ہوئی اسے تلاش کرتی پھرتی۔ اس کے پیار میں ماں کی ممتا کا جذبہ تھا۔ اس کی دیکھ بھال میں سلطانہ کو طرح کا سکون ملتا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ سلطانہ کی طبیعت خراب تھی۔ معمولی موسمی بخار تھا۔ نیاز نے اصرار کر کے بوڑھی خادمہ کے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس بھیجا اور خود کار کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔

❀ ❀ ❀

شام کا وقت تھا۔

انّو باہر باغیچے میں درختوں تلے حسب عادت تنہا بیٹھا تھا۔ جب اندھیرا خوب پھیل گیا تو وہ اٹھ کر گھر کے اندر گیا۔ اسی وقت نیاز نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ انّو کا خون خشک ہو گیا۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ سہما ہوا اس کے پاس پہنچا۔ نیاز اسے دیکھتے ہی غرایا۔

"ابے کہاں مر گیا تھا۔ کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں۔"

انّو نے حسب معمول اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ نیاز نے جل کر کہا۔ "سور کے بچے! منہ کیوں نہیں بولتا۔ اب تک کہاں آوارہ گردی کر رہا تھا؟"

انّو نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "باہر درختوں کے نیچے بیٹھا تھا۔"

نیاز نے ایک سڑی ہوئی گالی دے کر کہا۔ "اب تو جھوٹ بولنا بھی سیکھ گیا ہے۔ سمجھ لینا کھال اتار کے رکھ دوں گا۔ اس گھر میں رہنا ہے تو ٹھیک سے رہو ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ۔ میں نے کوئی آنکھ نہیں کھول رکھا۔"

دیر تک اس پر برستا رہا۔ پھر ڈپٹ کر بولا۔ ذرا الماری سے گلاس تو نکال اور وہ جو کونے میں شیشی رکھی ہے وہ بھی لیتا آ۔ میری طبیعت خراب ہے۔ ذرا سی دوا پیوں گا۔"

معنی معروف۔ عزلت پسندی: تنہا رہنے کی عادت۔

انّو چپ چاپ الماری کی طرف چلا گیا۔

جھٹ پٹا وقت تھا۔ ہوا سنکی ہوئی تھی۔ موسم سہانا تھا۔ نیاز کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ طبیعت کچھ بھاری بھاری تھی۔ اس نے سوچا اس وقت ایک آدھ پیگ وہسکی کا لگا لیا جائے تو طبیعت بشاش ہو جائے گی۔ اب وہ کبھی کبھار گھر پر بھی پی لیتا تھا۔ وہ شراب پینے کا موڈ بنا کر کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

انّو نے الماری سے گلاس نکالا۔ بوتل اٹھائی۔ اسی وقت نیاز نے چیخ کر کہا۔

"ابے کہاں مر گیا؟"

انّو گھبرا گیا۔ بدحواسی میں بوتل ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ فرش پر گرتے ہی اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ وہسکی برسات کے پانی کی طرح بہنے لگی۔ کمرے میں اس کی تیز بو پھیل گئی۔ نیاز لمحہ بھر کو خوں خوار نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ پھر اس نے وحشیوں کی طرح جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے انّو کے بال پکڑ لیے۔ کئی بار زور زور سے اسے جھنجوڑا اور پھر پوری طاقت سے دھکا دیا۔ وہ گیند کی طرح دیوار سے ٹکرا کر وہیں گر پڑا۔ نیاز نے قریب پہنچ کر اندھا دھند اس کی کمر پر، پیٹ پر، سینے پر لاتیں مارنا شروع کر دیں۔

انّو کے سینے پر ایک بھرپور لات پڑی تو وہ درد سے بلبلا کر فرش پر دہرا ہو گیا۔ نیاز نے ایک اور کس کے لات ماری۔ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ نیاز بھینسے کی طرح منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ انّو ذرا دیر تک تو لاش کی مانند بے سدھ پڑا رہا پھر اس نے اٹھ کر کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر نیاز نے جانے نہ دیا۔ لپک کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور بولٹ چڑھا دیا۔ انّو خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔

نیاز آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب گیا اور گریبان پکڑ کر ایک بار پھر اسے زور زور سے جھنجوڑنے لگا۔ پہلی بار انّو نے جرأت پیدا کی اور جل کر اپنا پورا منہ نیاز کی کلائی پر رکھ کر گوشت چبا ڈالا۔ نیاز نے تکلیف سے گھبرا کر بڑا گھناؤنا سا منہ بنایا۔ زور سے چلایا۔ "مار دیا سالے نے۔" اور پھر انّو کو فرش پر گرا کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ وہ اس کے بھاری بھرکم جسم کے نیچے مچھلی کی طرح تڑپا۔ نیاز نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ کر زور لگایا۔ انّو کے حلق سے بلیوں کے غرانے کی سی آواز نکلی۔ اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔

جھٹ پٹا: سورج غروب ہونے کا وقت۔ بشاش: تر و تازہ۔ خوں خوار: نہایت غصے سے بھری ہوئی۔ گھناؤنا: خوفناک۔

نیاز نے گھبرا کر اسے چھوڑ دیا۔ انّو آنکھیں پھاڑے دیر تک نیاز کو تکتا رہا۔ اس کے منہ سے
نکل رہی تھی۔ آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح سرخ ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر وہ اسی طرح سکتے کے عالم
رہا۔ پھر وہ درد سے کراہنے لگا۔ نیاز نے چیخ کر کہا۔
"تو ابھی میرے گھر سے نکل جا۔ ورنہ میں تجھے جان سے مار دوں گا۔"
انّو نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر ڈگمگا کر فرش پر گر پڑا۔ اس کا جسم پسینے سے تر بتر تھا۔ سانس
ہوئی تھی۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔
نیاز نے گالی دے کر کہا۔ "ابے اب جاتا ہے کہ سالے کچھ اور لے گا۔" وہ اس کی جانب
نظروں سے گھورتا ہوا اٹھا۔ انّو جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی بے بسی سے ہاتھ جوڑ
گڑگڑا کر فریاد کرنے لگا۔
"اب نہیں، اب نہیں۔"
نیاز بولا۔ "تو پھر نکل جا یہاں سے۔"
اس نے دروازے کا بولٹ کھول دیا۔ زور سے دہاڑا۔ "دیکھ اب لوٹ کے نہیں آنا۔ ورنہ میں
زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"
انّو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کمرے کے باہر چلا گیا۔ لیکن وہ کوٹھی میں
ٹھہرا۔ لان عبور کر کے پھاٹک سے نکلا اور سنسان سڑک پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

(۲)

رات نے اپنے پر پھیلا دیے تھے۔
کوچہ و بازار پر تاریکی پھیل گئی۔ انّو سنسان سڑک پر کئی گھنٹے تک آوارہ گردی کرتا رہا۔ مسلسل
رہا کہ اسے کہاں جانا چاہیے۔
مگر وہ کہیں نہیں گیا اور ایک ویران فٹ پاتھ پر تھک کر سو گیا۔
آدھی رات سے کچھ دیر پہلے انّو کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ مینہ برس

بے حس و حرکت۔ تر بتر: گیلا۔

رہا ہے۔ اسے اپنا بدن بھیگتا ہوا معلوم ہوا۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اسی وقت اندھیرے میں کسی کی گھبرا
ہوئی آواز ابھری۔

"اوئے تیرا خانہ خراب۔ ابے تجھے یہیں مرنے کو جگہ رہ گئی تھی۔"

انو نے دیکھا۔ ایک شخص اس کے سر پر کھڑا پیشاب کر رہا ہے۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا
سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ شخص اسی طرح اطمینان سے کھڑا پیشاب کرتا رہا۔ ذرا
بعد وہ فارغ ہوا تو ازار بند باندھتا ہوا قریب آکر بولا۔

"ابے یہاں کیوں سو رہا ہے۔ گھر میں جگہ نہیں؟"

انو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش بیٹھا ٹکر ٹکر اسے دیکھتا رہا۔

اس نے دوبارہ پوچھا۔ "یہیں رہتا ہے؟"

اس دفعہ انو نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ "نہیں۔"

ذرا دیر تک وہ شخص خاموش کھڑا رہا۔ اندھیرے میں وہ سائے کی طرح دھندلا نظر آرہا تھا
انو اس کے حلیے کا اندازہ نہ لگا سکا۔ اس کی آواز بھاری تھی۔ لب و لہجے سے گھٹیا قسم کا آدمی لگتا تھا۔ چند
لمحوں بعد اس کی آواز ابھری۔

"ابے تو یہاں کیوں پڑا ہے؟"

انو نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ نہ کوئی آہٹ
تھی نہ آواز۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ اچانک رات کی خاموشی میں گھوڑے کی ہنہناہٹ ابھری۔ انو نے
دیکھا، چند قدم کے فاصلے پر ایک تانگا کھڑا ہے۔ گھوڑا ہنہنا ہنہنا کر سڑک پر ٹاپیں مار رہا تھا۔ وہ آدمی
گھوڑے کو چمکارنے لگا۔ "او ذرا دم لے بادشاہ! میں ابھی آیا۔" پھر اس نے پلٹ کر انو سے کہا۔

"ابے یہاں کوڑے کے ڈھیر پر کیوں پڑا ہے؟ چل میرے ساتھ۔"

انو خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اس دفعہ وہ آدمی جو تانگے
والا تھا، بے تکلفی سے بولا۔ "ابے اب کھڑا بھی ہو۔" اس نے انو کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

انو اس کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا۔ اس نے چابک ہوا میں لہرائی۔ باگیں کھینچیں۔ گھوڑا
آگے بڑھ گیا۔ دور تک سرمئی سڑک پھیلی تھی جس پر گھوڑے کے پیروں میں لگے ہوئے نعل
ٹاپ بج رہے تھے۔ انو کچھ دیر بیٹھا ہچکولے کھاتا رہا۔ پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر

پہلوان جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا۔ تانگا ایک تنگ بازار سے آہستہ آہستہ گزر رہا ہے۔ بازار سنسان تھا۔ پنواڑیوں اور دودھ والوں کی اکا دکا دکانیں ابھی تک کھلی تھیں جن پر تیز روشنی ہو رہی تھی۔ تانگے والے نے ایک دودھ والے کی دکان کے سامنے تانگا ٹھہرایا۔ اتر کر دکان پر گیا۔ دودھ والے نے بھاری بھرکم جسم کا آدمی تھا بڑی بے تکلفی سے بولا۔

"کہاں نوروز خان کہاں سے آ رہے ہو؟ آج تو تم نے بڑی دیر لگا دی۔"

نوروز بولا۔ "یار چھاؤنی کی ایک سواری لے کر گیا تھا، پلیٹھین نکل گیا اپنا۔" اس نے لمحے بھر توقف کر کے کہا۔ "لا یار سیر بھر دودھ تو دے۔ بڑے آب خورے میں دینا۔"

"یہاں نہیں پیو گے؟"

"نہیں یار ساتھ لے جاؤں گا۔"

نوروز کا جواب سن کر دودھ والا چونکا۔ اس نے جھک کر تانگے کی جانب دیکھا جس میں انو سویا بیٹھا تھا۔ اس نے آنکھ مار کر پوچھا۔ "تو یوں کہو نا! ابے کہاں سے پٹا لایا۔"

نوروز مسکرایا۔ "بس پوچھ نہ، چڑھ گیا ہتے۔ اللہ سب کو رزق دیتا ہے پہلوان۔"

دودھ والے نے ایک بار پھر انو کو دیکھا۔ ران کھجاتے ہوئے بولا۔ "لونڈا تو صورت شکل کا اچھا ہے۔ پر یار یہ تو بہت چھوٹا ہے۔ ابے یہ مر جائے گا۔ سالے کھنچے کھنچے پھرو گے۔ میرا کہنا مانو چکر اب چھوڑ دے۔ گھر در بسا لے۔"

نوروز بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ "ابے کیا رکھا ہے گھر بسانے میں۔ خواہ مخواہ کا ٹنٹا ہے۔"

"تم کو تو سالے چاٹ ہی اور لگ گئی ہے۔"

"یار پہلوان! تو زیادہ باتیں نہ بنایا کر۔ لا دودھ دے۔" یہ کہہ کر نوروز نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر دودھ والے کو دیا۔ "ربڑی ہو تو پاؤ بھر وہ بھی دے دے۔ ربڑی نہ ہو تو کچھ اور میٹھا دے دے۔"

دودھ والا بولا۔ "آج تو بڑے زوروں پر جا رہا ہے۔"

نوروز صرف مسکرا کر رہ گیا۔ پہلوان نے دودھ سے بھرا ہوا آب خورہ اسے دیا۔ کہنے لگا۔ "پانی ہے نہیں۔ جلیبیاں دے دوں؟"

دودھ بیچنے والا۔ آب خورہ: مٹی کا پیالہ جس میں پانی وغیرہ پیتے ہیں۔ پٹانا: پھانسنا۔ گھر بسانا: شادی کرنا۔ ٹنٹا: ذمہ داری، بوجھ۔ چاٹ:

"لایا روہی دے۔ دیر نہ کر۔"

پہلوان نے جلیبیاں اور پانچ روپے کے نوٹ سے بچی ہوئی رقم اس کے حوالے کر دی۔ نو نے تانگے کے قریب آ کر دودھ کا آب خورہ اور جلیبیوں کا پڑا انو کو تھما دیا۔ خود اچک کر تانگے پر ہو گیا۔ گھوڑے نے حرکت کی اور تانگا بازار سے گزرنے لگا۔

مختلف راستوں کے چکر کاٹنے کے بعد تانگا ایک احاطے کے اندر داخل ہوا۔ احاطے کی دیواری بوسیدہ تھی۔ اندر کھپریل کی چھتوں والے چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ ان ہی میں نور کو ٹھری بھی تھی۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ نوروز نے تالا کھولا۔ ماچس جلا کر چند ھی سی لالٹین رو کی جس کی چمنی ٹوٹی ہوئی تھی۔ کوٹھری میں ایک طرف پلنگ پڑا تھا جس پر میلے کچیلے بستر کے نوروز کے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک ٹرنک تھا جس پر کنگھا، تیل کی شیشی اور ایک چھوٹی موٹی چیزیں رکھی تھیں۔

نوروز نے لالٹین روشن کی۔ بستر پر سے کپڑے ہٹائے۔ انو سے بولا۔ "تم یہاں بیٹھو۔ گھوڑا کھول کر تھان پر باندھ دوں۔ بس ابھی آیا۔ گھبرانا نہیں۔"

وہ دروازے سے باہر چلا گیا۔ کوٹھری کی فضا مرطوب تھی اور عجیب سی بساند پھیلی ہوئی تھ انو خاموشی سے پلنگ پر دونوں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا اور کوٹھری کی ایک ایک چیز کھوئی کھوئی نظروں دیکھنے لگا۔ وہ ابھی تک گم صم تھا۔ ہر چیز اس کے لیے اجنبی تھی۔ ہر بات انوکھی تھی۔ گذشتہ ساتھ گھنٹوں میں اس کی زندگی میں کچھ اس طرح پے بہ پے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں کہ سو سمجھنے کی صلاحیت جواب دے گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف خوابوں کا دھندلکا چھایا تھا جس میں کی اپنی ذات گم ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر احساس دم بخود تھا۔

نوروز واپس آیا۔ اس نے کوٹھری کے دروازے کی کنڈی لگائی۔ المونیم کے بڑے کٹورے میں دودھ اور جلیبیاں لے کر انو کے پاس گیا۔ انو نے صرف سہ پہر کی چائے پی تھی۔ اب سخت بھوک لگ رہی تھی۔ نوروز نے اصرار کیا تو اس نے دودھ میں بھیگی ہوئی جلیبیاں کھالیں نوروز نے ہاتھ بڑھا کر طاق سے لالٹین اٹھائی اور پھونک مار کر بجھا دی۔

❁ ❁ ❁

اچک کر: چھلانگ لگا کر۔ کھپریل: گھاس پھونس۔ تھان: گھوڑا کھڑا کرنے کی جگہ۔ مرطوب: گیلی۔ بساند: بدبو۔

نوروز سویرے بہت تڑکے اٹھ کر کوٹھری سے باہر چلا گیا۔
اُنو کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ نہ جانے کب سے جاگ رہا تھا اور بستر پر لاش کی
بے سدھ پڑا تھا۔ اس نے نوروز کو باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ روشن دان سے ابھرتی ہوئی ہلکی
ہلکی روشنی بھی دیکھی۔ سویرا ہو رہا تھا۔ کہیں قریب ہی مسجد سے اذان بلند ہو رہی تھی۔
احاطے میں ملی جلی آوازیں ابھرنے لگیں۔ بچوں کے رونے کی آوازیں، بوڑھوں کی کھانسی،
ں کی چیخ پکار۔ یہ سب آوازیں گھل مل کر ہلکے ہلکے شور میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔ اُنو چپ
شور کو سنتا رہا۔ روشن دان سے ابھرنے والی روشنی کو دیکھتا رہا۔
نوروز جب واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں گرم گرم پوریوں کا پڑا دبا ہوا تھا۔ اس نے اُنو پر ایک
ل۔ مسکرا کر بولا۔
"ابے تو ابھی تک لیٹا ہے؟ منہ ہاتھ تو دھو لیا ہوتا۔"
اُنو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پلنگ سے نیچے اترا تو اس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ اس نے کونے
کے ہوئے لوٹے میں گھڑے سے پانی بھرا اور کوٹھری کے دروازے پر جا کر منہ دھونے لگا۔
اس کا جی متلا رہا تھا۔ مگر نوروز نے اصرار کر کے اسے دو پوریاں زبردستی کھلا ہی دیں۔ چار
اس نے اُنو کے دوپہر کے کھانے کے لیے رکھ دیں۔ نرم لہجے میں بولا۔
"موقع لگا تو میں دوپہر کو آجاؤں گا۔ نہیں تو رات کو واپسی ہو گی۔ گھبرانا نہیں۔ کسی چیز کی
ت ہو تو بتا دے۔"
اُنو نے کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ نوروز نے اس کی پیٹھ تھپتھپا
"اب تو اطمینان سے پڑ کر سو۔ طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ بھوک لگے تو پوریاں کھا لینا۔
کھانا میں لے کر آؤں گا۔ ٹھیک ہے نا؟"
اس نے اُنو کے رخسار میں ہولے سے چٹکی بھری۔ مسکرا کر بولا۔ "وکیل صاحب کو دیر
ہو گی۔ مجھے ان کے لیے تانگا لے کر جانا ہے۔ گھبرانا مت۔" وہ کوٹھری سے باہر نکلا۔ دروازہ
ر اس میں تالا لگا دیا۔
اُنو دن بھر کوٹھری میں نڈھال پڑا رہا۔ سہ پہر کو ذرا بھوک لگی مگر ایک پوری بھی نہیں کھائی
جانے کیسی طبیعت ہو رہی تھی۔ اس نے گلاس بھر کر پانی پیا اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔

رات کو دس بجے کے قریب نوروز آیا۔ وہ اپنے ساتھ روٹیاں اور سالن لایا تھا۔ اس کے علاوہ انو کے لیے ایک پھولدار ریشمی بش شرٹ بھی لایا تھا۔ اس نے بڑے شوق سے بش شرٹ اسی وقت انو کو پہنائی اور ہنس کر بولا۔

"بچ گئے استاد۔ اب میرے ساتھ رہا تو عیش کرادوں گا۔"

انو کو بش شرٹ پہن کر کوئی خاص مسرت نہ ہوئی۔ مگر نوروز بڑا خوش نظر آرہا تھا۔ بار بار بش شرٹ کی تعریف کرتا۔ اس کی اپنی قمیص خاصی میلی تھی۔ شلوار اس سے بھی زیادہ میلی تھی۔ وہ دہرے بدن کا لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ تیس بتیس کے لگ بھگ عمر ہوگی۔ رنگ سانولا تھا۔ سر پر لمبے لمبے بال تھے۔ آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ہنستا تو آنکھیں بند ہو جاتیں۔ چہرہ کچھ ایسا بے ڈھنگا ہو جاتا کہ اچھا خاصا الو کا پٹھا معلوم ہوتا۔

لیکن وہ الو کا پٹھا ہرگز نہ تھا۔ روزانہ دس بارہ روپے اور کبھی کبھی تو اٹھارہ بیس روپے کما لاتا۔ طبیعت میں چٹورپن تھا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتا ہی رہتا تھا۔ شہر کے تانگے والوں میں وہ بڑا سرکش مشہور تھا۔ ذرا سی بات پر لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ ہاتھ پاؤں اچھے تھے اس لیے لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا جب اڈے پر کسی تانگے والے سے اس کی تو تکار نہ ہوتی۔ اکثر اس گالی گلوچ میں ہاتھا پائی کی نوبت آجاتی۔

لیکن انو کے ساتھ نوروز کا رویہ بڑا اچھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آتا۔ انو نے بھی کبھی اسے ناراض ہونے کا موقع نہ دیا۔ وہ فطرتاً کم گو تھا۔ اب اس نے بولنا اور بھی بند کر دیا تھا۔ ہر وقت چپ چپ رہتا۔

نوروز روزانہ صبح کوٹھری میں تالا لگا کر چلا جاتا اور رات گئے آکر کھولتا۔ واپسی پر انو کے لیے کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ اکثر اور بھی کچھ نہ کچھ لے آتا۔ کھانا کھانے کے بعد نوروز زور زور سے ڈکاریں لیتا اور دھم سے بستر پر گر جاتا۔ انو کو آواز دے کر قریب بلاتا۔

"لے بے ذرا ٹانگیں تو دبا دے۔"

انو پائنتی بیٹھ کر چپ چاپ اس کی موٹی موٹی پنڈلیاں دبانے لگتا۔ نوروز اس وقت باتیں کرنے کے موڈ میں ہوتا۔ وہ انو سے پوچھتا۔ "کیوں بے کوئی تکلیف تو نہیں؟"

الو کا پٹھا: مروبد شکل، ڈرپوک۔ چٹورپن: کھانے کا شوق۔ سرکش: لڑاکا۔ پائنتی: چارپائی کا پاؤں کی طرف کا حصہ۔

اونا سر انکار میں ہلا دیتا۔

وہ اصرار کر کے پوچھتا۔ "دیکھ بے کسی چیز کی ضرورت ہو تو فوراً کہہ دیا کر۔"

"اچھا۔" اُنو کا جواب بہت مختصر ہوتا۔

نوروز کو اس کی یہ خاموشی کبھی کبھی بڑی گراں گزرتی۔ وہ کسی قدر تیکھے لہجے میں کہتا۔ "ابے تو ہے کو اتنا چپ کا روزہ رکھا ہے۔ ذرا بات چیت کیا کر۔ یہ کیا ہونٹ سیئے بیٹھا ہے۔ اور دیکھ جو تیرا جی چاہے بے خوف مجھ سے کہہ دیا کر۔ دیکھ تو میں تیری بات پوری کرتا ہوں کہ نہیں۔"

اس کے اسی اصرار پر آخر ایک روز اُنو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"مجھے اسکول میں داخل کرا دو۔"

نوروز حیرت سے چونک پڑا۔ "اسکول میں داخل کرا دوں؟" وہ لمحہ بھر خاموش رہا۔ "ابے کیا کرے گا اسکول جا کر۔ وہاں تو لڑکے جا کر ایک نمبر آوارہ ہو جاتے ہیں۔ جا بے تو بھی یوں ہی رہا۔"

اس کے اس جواب سے اُنو کو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ سوچا کرتا کہ اسکول میں داخل ہو جائے گا، تو پڑھے گا۔ پھر اچھی سی کوئی نوکری کر لے گا اور سلطانہ کو اپنے پاس بلا لائے گا۔ اسے سلطانہ کی یاد آتی تھی۔ اسے یاد کر کے وہ اکثر رو پڑتا۔ اب وہ اس کے پاس جا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ نیاز دیکھ لیتا تو اسے زندہ نہیں چھوڑتا۔

نوروز کے پاس رہتے ہوئے اُنو کو دو ہفتے سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ نوروز اسے روزانہ کوٹھری میں بند کر کے چلا جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ اُنو دن بھر کوٹھری میں قید رہتا۔ کبھی کبھی دل گھبراتا تو کرب بے چینی سے چکر کاٹنے لگتا۔ پھر اپنی بے کسی پر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتیں۔ سسکیاں بھر کر دیر تک روتا رہتا۔ نوروز سے اس کو کراہیت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے ہونٹ غلیظ تھے۔ منہ سے بڑی خراب بو آتی تھی۔ ابابیل کے پروں کی طرح گھنی مونچھیں تھیں۔ جب پیار کرتا تو اُنو کا جی متلانے لگتا۔ بس چلتا تو وہ نوروز کے منہ پر تھوک دیتا۔

ایک رات نوروز واپس آیا تو نشے میں دھت تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ قدم بہکے بہکے پڑ رہے تھے۔ اس نے کوٹھری میں داخل ہوتے ہی اُنو کو خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ جھوم کر بولا۔

"گنڈی لگاوے۔"

بے بسی: مجبوری۔ کراہیت: نفرت۔ غلیظ: گندے۔ خمار آلود: نشیلی۔

اس کی آواز اس وقت پھٹے بانس کی طرح بے ڈھنگی تھی۔ انّو نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ نوروز کوٹھری کے بیچوں بیچ کھڑا جھومتا رہا۔ اس نے گہری نظروں سے انّو کو دیکھا۔ "تو ہم آ بے۔"۔ انّو چپ چاپ اس کے پاس چلا گیا۔

نوروز نے لالٹین پر ایک لات ماری جو دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ لالٹین بجھ لو چند بار بھڑکی اور بجھ گئی۔ کوٹھری میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔

صبح اٹھ کر نوروز نے دیکھا انّو غائب تھا۔ اس کی نظر فوراً دروازے پر گئی۔ کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر جا کر دیکھا۔ انّو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ رات کو نہ جانے کب اٹھ کر فرار ہو گیا۔

نوروز دن بھر پاگلوں کی طرح تانگے پر بیٹھا انّو کو تلاش کرتا رہا مگر کہیں اس کا سراغ نہ ملا۔ کئی روز تک وہ جگہ جگہ اسے ڈھونڈتا رہا لیکن انّو ایسا غائب ہوا کہ پھر نظر نہ آیا۔

کئی مہینے گزر گئے۔

❁ ❁ ❁

نوروز قریب قریب انّو کو بھول چکا تھا کہ ایک روز وہ اچانک نظر آ گیا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ بازاروں کی رونق اجڑ چکی تھی۔ نوروز تھکا ہارا لوٹ رہا تھا۔ سڑک کے ایک موڑ پر اس نے دیکھا۔ بجلی کے کھمبے کے پاس انّو کھڑا ہے۔ وہ اس وقت بوسکی کی قمیص اور شلوار پہنے تھا۔ گلے میں پھولوں کا گجرا تھا۔ کلّے میں پان تھا۔ آڑی مانگ نکلی تھی۔ بجلی کی روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کے ہمراہ تین آدمی تھے۔ وہ اجلے لباس پہنے ہوئے تھے اور وضع قطع سے اوباش نظر آتے تھے۔ انّو مسکرا مسکرا کر ان سے باتیں کر رہا تھا۔

نوروز نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے تانگا آگے بڑھایا اور عین ان لوگوں کے سامنے جا کر روک لیا۔ نیچے اترا۔ انّو نے دیکھا تو چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ نوروز نے تنتنے بھلا کر خونخوار نظروں سے دیکھا۔

"کیوں بے حرام کے تخم۔" نوروز کے منہ سے جھاگ اڑنے لگا۔ اس کی مونچھیں خطرناک طریقے پر پھڑپھڑانے لگیں۔ اس نے لپک کر انّو کا بازو دبوچ لیا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "منہ کیا تک رہا ہے سیدھی طرح چلتا ہے کہ دوں ایک ہاتھ۔"

وضع قطع: ظاہری حالت۔ اوباش: بدمعاش۔ تنتنے بھلا کر: غصے سے۔

چند لمحے بھر تک حیرت سے آنکھیں پھاڑے نوروز کو تکتے رہے۔ پھر ایک نے آگے
کہا۔ "بات کیا ہے جی؟"
نوروز بولا۔ "اسی سے پوچھ لو۔"
"اس سے تو بعد میں پوچھیں گے۔ پہلے تم بتاؤ۔"
نوروز بگڑ کر بولا۔ "دیکھو جی بہت دن تم نے میرا لونڈا رکھ لیا۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ
چپ چاپ الگ کھڑے رہو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"
وہ شخص طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اچھا" اور اپنے ساتھ والے سے مخاطب ہوا۔ "لو جی یہ لونڈا
ہو گیا۔"
نوروز نے کہا۔ "اس سے پوچھ کر تو دیکھو۔"
وہ شخص بولا۔ "اس سے کیا پوچھنا ہے۔ آٹھ سو روپیہ نقد خرچ کیا ہے۔ تانگا گھوڑا بک جائے
گا تو بھی بھجرے سے پوچھ لو کیا رقم دی ہے اس لونڈے کی۔"
وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اتو نوروز کی کوٹھری سے نکل کر بھاگا تو راستے میں نبو بھجرے سے
ہو گئی۔ نبو اب سن سے اتر چکا تھا۔ اس نے تانگہ کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ گھیر گھار کر نوخیز
لڑکوں کو لاتا۔ کچھ دن ان کی کمائی کھاتا اور جب کوئی مالدار اسامی مل جاتی تو اس کے ہاتھ فروخت کر
دیتا۔ لڑکوں کی خوف زدہ نگاہیں دیکھ کر نبو کی تجربہ کار نظریں تاڑ گئیں کہ گھر سے بھاگا ہوا ہے۔ اس نے
لالچ دیا اور بہلا پھسلا کر اپنی کوٹھری میں لے آیا۔ کچھ عرصہ اپنے پاس رکھا۔ پھر علی جان کے
ہاتھ بیچ دیا۔
اس وقت نوروز سے علی جان ہی بات کر رہا تھا۔ وہ چمڑے کا کاروبار کرتا تھا۔ آمدنی اچھی تھی۔
ناچ رنگ کی عیاشی کرتا تھا۔ خود بھی مزاج میں غنڈا پن تھا اور دو چار بدمعاشوں کو بھی ساتھ رکھتا تھا۔
نوروز نے گالی دے کر کہا۔ "میں کسی سالے نبو وبو کو نہیں جانتا۔ میں تو ابھی اسے لے کر
جاؤں گا۔"
علی جان نے کہا۔ "لے جایا جائے تو لے جاؤ۔"
نوروز نے گردن اونچی کر کے کہا۔ "دیکھوں تو کون مائی کا لال مجھے روکتا ہے۔" اس نے اتو کا

ہاتھ تھاما۔ سن سے اتر چکا تھا: مراد نوجوان نہ رہا تھا۔ تانگہ: جس کے ماتحت کئی طوائفیں ہوں۔ مائی کا لال: بہادر مرد۔

ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا۔ "چل بے۔"

اسی وقت علی جان کا ایک ساتھی بڑھ کر آگے آیا۔ نوروز کو آہستہ سے دھکا دے کر بولا "الگ ہٹ کر بات کر۔"

نوروز نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اور ڈپٹ کر بولا۔ "یہ مت سمجھنا کہ اکیلا ہوں تینوں پر بھاری ہوں"۔

مگر وہ شخص مشتعل نہ ہوا۔ نرمی بولا۔ "جا بھئی اپنا کام کر۔ کیوں خواہ مخواہ سر ہوئے جا رہا ہے۔"

نوروز نے پھر انو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ علی جان کے ساتھی نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑا سا کمانی دار چاقو باہر نکال لیا۔ کڑکڑ کر کے چاقو کے کھلنے کی آواز ابھری۔ چاقو کی جھلکتی ہوئی نوک نوروز کے پیٹ پر تھی۔

وہ آدمی ڈپٹ کر بولا۔ "اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔ ورنہ لاش بھی ڈھونڈنے سے نہ ملے گی۔"

نوروز چپ چاپ کھڑا جھلکتے ہوئے چاقو کو دیکھتا رہا۔

علی جان نے نوروز کو گالی دے کر کہا۔ "ابے اب یہاں سے ٹلے گا بھی یا بتیا کرانے کا ارادہ ہے؟"

نوروز پسپا ہونے کے سے انداز میں پیچھے ہٹا اور گردن جھکا کر تانگے کی طرف چل دیا۔ جب وہ تانگے پر سوار ہونے لگا تو علی جان نے کہا۔

"آئندہ ادھر کا رخ نہ کرنا، ورنہ ٹھنڈے ٹھنڈے پڑے ہو گے۔"

نوروز کو ان پر تاؤ تو بہت آیا مگر وہ ایک نہیں تین تھے اور مسلح بھی تھے وہ بالکل نہتا تھا۔ اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ گھوڑے کی لگام کھینچی اور تانگے کو آگے بڑھا دیا۔ کولتار کی پختہ سڑک پر اس کے تانگے کی آہٹ دور تک ابھرتی رہی انو بجلی کے کھمبے کے ساتھ علی جان اور اس کے ساتھیوں کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔

نہتا: مسلح۔ نہتا: خالی ہاتھ، اسلحہ کے بغیر۔

انّو گھر سے نکلنے کے بعد واپس نہ آیا۔

سلطانہ روزانہ اس کا انتظار کرتی۔ اسے امید تھی کہ انّو ایک نہ ایک روز ضرور واپس آئے گا۔ نے انّو کی ایک ایک چیز سنبھال کر الماری میں رکھ دی تھی۔ اس کے لیے کپڑوں کے نئے نئے ے سلوائے تھے۔ وہ بھی الماری میں رکھے تھے۔ جب انّو بہت یاد آتا تو وہ الماری کھول کر کھڑی جاتی اور ساری چیزوں کو حسرت سے دیکھتی۔ پھر اس کا دل بھر آتا۔ بے اختیار رو پڑتی۔ انّو سے بڑی ڈھارس تھی۔ اس کے جانے کے بعد تنہائی کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح گھر چکر کاٹا کرتی۔

گھنٹوں دریچے پر کھڑی سڑک کی جانب خواب ناک نظروں سے تکا کرتی کہ شاید انّو آتا ہوا آجائے۔

اسے اس قدر پریشان دیکھ کر گھر کی خادمہ نے ایک روز بتایا کہ گلی میں ایک شاہ صاحب ہیں۔ پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ فال نکال کر ایسی پتے کی باتیں بتاتے ہیں کہ آدمی دنگ رہ جائے۔ ان کا یا ایک پرایک ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کئی حیرت انگیز واقعات بھی سنائے جن کو سن کر اشتیاق اس قدر بڑھا کہ ایک روز جب نیاز باہر گیا ہوا تھا اس نے خادمہ کو اپنے ہمراہ لیا اور شاہ صاحب کے ہاں جا پہنچی۔ اس نے دیکھا۔ حاجت مندوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ دور دور سے لوگ ان کے آئے تھے۔ ان کا قیام ایک ٹیلے کے دامن میں تھا۔ یہ مختصر سا نیم پختہ مکان تھا۔ اس میں کل دو ے تھے۔ کمروں کے آگے سائبان تھا جس میں مردوں کے لیے انتظام تھا۔ ایک کمرے میں پردہ نشین بیٹھی تھیں۔ سلطانہ بھی وہیں جا کر بیٹھ گئی۔ وہ نو بجے دن کو وہاں پہنچی تھی۔ دوپہر کو اس کی ہوئی۔

کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ شاہ صاحب مسند پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ قریب ہی ایک اگر سوز رکھا تھا جس میں اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ کمرے میں ہر طرف تیز خوشبو پھیلی

لغوی معنی: دریچہ: کھڑکی۔ ایک پرایک ہے: بہت اچھا ہے۔ اشتیاق: شوق۔ جمگھٹا: ہجوم۔ اگر سوز: وہ برتن جس میں اگر بتی

تھی۔ وہ ادھیڑ آدمی تھے۔ خوب گھنی ڈاڑھی تھی۔ سر پر کاکلیں تھیں۔ اس وقت وہ زعفرانی رنگ کرتا اور ویسا ہی تہبند باندھے ہوئے تھے۔ چہرے سے جلال ٹپکتا تھا۔ سلطانہ اندر پہنچی تو وہ آنکھیں بند کئے مراقبے کے عالم میں تھے۔ سلطانہ کے ساتھ خادمہ بھی تھی۔

دونوں غالیچے کے ایک سرے پر مؤدب ہو کر بیٹھ گئیں۔ شاہ صاحب آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے۔ کمرے میں گہرا سکوت تھا۔ اچانک شاہ صاحب کی آواز ابھری۔

"لڑکی تیرا بھائی شمال مشرق کی جانب گیا ہے۔ وہ ایک شخص کے چنگل میں بری طرح پھنسا ہے۔"

سلطانہ نے چونک کر دیکھا۔ وہ بدستور آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ سلطانہ کو سخت حیرت ہوئی کہ انہیں کس طرح یہ علم ہوا کہ وہ اپنے بھائی کے بارے میں معلوم کرنے آئی ہے۔ ان سے اس بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ فرطِ عقیدت سے اس کی گردن جھک گئی۔ کمرے میں اگر سوز سے ابھرا ہوا ہلکا نیلگوں دھواں لہرا رہا تھا۔ گہری خاموشی اور اگر بتیوں کی تیز خوشبو نے ماحول کو آسیب زدہ بنا دیا تھا۔

ذرا دیر بعد شاہ صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ سلطانہ کو نظر بھر کر دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر بولے۔ "تم دونوں کب آئیں؟" سلطانہ تو خاموش رہی البتہ خادمہ نے کہا۔

"ہم کو تو آئے ہوئے دیر ہو گئی۔ بلکہ آپ نے بی بی جی سے کچھ کہا بھی تھا۔"

"کاہے کے بارے میں؟"

"ان کا چھوٹا بھائی بہت دنوں سے لاپتہ ہے۔ اسی کے بارے میں آپ نے کہا تھا۔"

شاہ صاحب زیرِ لب مسکرائے۔ "اچھا اچھا۔ میں تو نہ جانے کہاں پہنچ گیا تھا۔" لمحہ بھر رک کر انہوں نے کہا۔ "حاجیوں کا ایک جہاز عدن کے قریب سمندری طوفان میں گھر گیا تھا مجھے حکم ملا فوراً جا کر حاجیوں کو بچاؤ۔ اللہ غنی کیا عالم تھا۔ جہاز میں کہرام برپا تھا۔ ہر شخص موت کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ موجیں دھاڑتی ہوئی اٹھ رہی تھیں۔ جہاز درخت کے پتے کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔" اس طرح آہستہ آہستہ بول رہے تھے جیسے خواب میں بڑبڑا رہے ہوں۔

زعفرانی رنگ کا: زرد رنگ کا۔ جلال: نور، چمک۔ چنگل میں آجانا: قابو میں آنا۔ فرطِ عقیدت: بہت زیادہ عقیدت۔ کہرام برپا ہونا: شور اور ہنگامہ برپا ہونا۔

خادمہ کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سلطانہ کا سر عقیدت سے اور جھک گیا۔

شاہ صاحب نے زعفران کی روشنائی سے دو تعویز لکھے اور سلطانہ کو دیتے ہوئے بولے۔ "یہ لو گھر کے شمالی کونے میں کھود کر دفن کر دینا۔ دوسرا کسی اونچے درخت پر لٹکا دینا۔ جیسے جیسے ہوا تعویذ ہلے گا ویسے ہی لڑکے کے دل میں ہول اٹھے گا۔ گھر کی یاد ستائے گی۔ انشاء اللہ شام تک ہی آجائے گا۔"

سلطانہ نے تعویذ لے کر پرس سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ اسے نذرانے کے طور پر کرنا چاہا تو شاہ صاحب ہنس پڑے۔

"تمہارا بھائی آجائے تو ایک سیاہ بکرا صدقہ کر دینا۔ اس کا گوشت غریبوں محتاجوں میں تقسیم ربا۔"

سلطانہ نے نوٹ پرس میں واپس رکھ لیا۔ شاہ صاحب سے اجازت لی اور خوشی خوشی گھر آگئی۔

شاہ صاحب کی ہدایت کے مطابق اس نے ایک تعویذ زمین میں دفن کرادیا۔ دوسرا باغیچے میں ہوئے پیپل کے پیڑ کی اونچی شاخ پر لٹکوادیا۔ اسے یقین تھا کہ انو ضرور آجائے گا۔ شاہ صاحب قبت کا طلسم اس پر پوری طرح چھا گیا تھا۔

اس روز اس نے خانساماں کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے سامنے کھیر تیار کرائی۔ انو کھیر بڑے سے کھاتا تھا۔ سہ پہر تک وہ بڑی خوش خوش رہی۔ جب دن ڈھلنے لگا اور دھوپ کا رنگ گہرا ہو گیا تو وہ بے چین ہو گئی۔ بار بار دریچے پر جا کر باہر دیکھتی۔ سورج غروب ہو گیا۔ دن کا الاؤ بجھ گیا۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ شام ہو گئی مگر انو نہ آیا۔

رات ہو گئی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔ راستے سنسان پڑ گئے۔ مگر انو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ ساری رات اگی اور انو کا انتظار کرتی رہی۔

مگر بہت سی شامیں آئیں اور گزر گئیں اور شاہ صاحب کا تعویذ پیپل کی اونچی شاخ پر لہراتا رہا۔ نے دوبارہ شاہ صاحب کے پاس جانے کے لیے اصرار بھی کیا۔ لیکن سلطانہ پھر ان کے پاس نہ ں کی عقیدت کا طلسم درہم برہم ہو چکا تھا۔

لہ: خوش پیدا ہونا، گھبراہٹ ہونا۔ طلسم: جادو۔

نیاز کو سلطانہ کے دکھ کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ ہر طرح اس کی ناز برداری کی کوشش کرتا۔ ان دنوں وہ روزانہ کچھ نہ کچھ اس کے لیے خرید کر لاتا۔ اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا۔ انو کے چلے جانے پر اظہار افسوس کرتا۔ لیکن سلطانہ اس سے کھنچی کھنچی اور بے زار بے زار سی رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ انو نے صرف اس کی وجہ سے گھر چھوڑا ہے۔ حالانکہ بوڑھے خانساماں نے صرف اس قدر بتایا تھا کہ اس نے نیاز کو انو پر ناراض ہوتے سنا تھا۔ اس کے بعد انو کو ٹھی کا پھاٹک کھول کر چپ چاپ باہر چلا گیا۔

جب وہ اس بات پر غور کرتی تو اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی۔ نیاز کے خلاف شدید نفرت کا طوفان امڈ آتا۔ اس کا جی چاہتا کہ اس کو ٹھی سے کہیں چلی جائے۔ ہر طرف نظریں دوڑاتی مگر اسے کوئی بھی سہارا کوئی بھی اپنا غم گسار نظر نہ آتا۔ ایسے عالم میں کبھی کبھار سلمان کا بھی خیال آتا۔ مگر اس کی یاد کے ساتھ ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ اگر سلمان مل جائے تو وہ اس کا منہ نوچ لے۔ اس کے چہرے پر تھوک دے اور ہزاروں کوسنے دے۔ پھر وہ سوچتی، کاش ایک بار سلمان اسے مل جائے اور وہ اسے یہاں لاکر دکھائے کہ اب سلطانہ وہ لڑکی نہیں رہی جسے غریب اور لاوارث جان کر اس نے ٹھکرا دیا تھا۔ اب وہ شاندار کوٹھی میں رہتی ہے۔ اس کے پاس کار ہے، قیمتی فرنیچر ہے، نوکر ہیں، خدمت گار ہیں جن پر اس کا حکم چلتا ہے۔ اس کے پاس ڈھیر سارے ریشمی کپڑے ہیں۔ زیورات ہیں۔ جوتوں کی درجنوں جوڑیاں ہیں۔ وہ جس قدر ٹھاٹ باٹ سے رہتی ہے، اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

انہی دنوں ایک بار اصرار کر کے نیاز اسے اپنے ہمراہ خان بہادر فرزند علی کے گھر لے گیا۔ خان بہادر بڑی شاندار کوٹھی میں رہتا تھا۔ اس کا رہن سہن شاہانہ تھا۔ ہر کمرے میں عمدہ اور قیمتی فرنیچر تھا۔ کام کاج کے لیے نوکروں کی پلٹن تھی۔ مگر اس کی بیوی بڑی چھچھوری اور خردماغ تھی۔ اترا اترا کر بات کرتی تھی۔ اس کے ہر انداز سے نو دولتا پن ٹپکتا تھا۔ البتہ دونوں لڑکیاں بہت شائستہ اور ملنسار تھیں۔ بڑا لڑکا بھی خوش اخلاق اور بہت ہنس مکھ تھا۔

شام کی چائے اس نے تینوں کے ساتھ پی۔ لڑکے کا نام شاہد علی تھا۔ لمبا نکلتا ہوا قد، مہ

ناز برداری: ناز اٹھانا۔ کوسنے دینا: برا بھلا کہنا۔ چھچھوری: کم ظرف۔ خردماغ: مغرور، بد دماغ۔

نیلی پتلیوں، نیلے نقوش، بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ وہ خاصا خوبصورت نوجوان تھا۔ بی ایس سی کر چکا تھا اور اسکالرشپ پر ایم بی اے کرنے کے لیے امریکہ جانے والا تھا۔ چائے پر بھی امریکہ کے متعلق ہی گفتگو ہوتی رہی۔

دوران گفتگو شاہد نے اچانک سلطانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مسز نیاز آپ کو دیکھ کر تو بڑی حیرت ہوئی۔"

سلطانہ کو مسز نیاز کہنے پر سخت تعجب ہوا۔

اس کا جی چاہا کہ اس غلط فہمی کو دور کر دے۔ پھر یہ سوچ کر چپ ہو گئی کہ نیاز نے نہ جانے اس کے متعلق ان لوگوں سے کیا کہا ہے۔ سلطانہ کو بڑا غصہ آیا۔ کم بخت نے کم سے کم اشارہ ہی کر دیا ہوتا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اس نے شاہد سے کہا۔ "آپ کو حیرت کیوں ہوئی؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھتا تھا نہ جانے آپ کیسی ہوں گی۔" اس کے انداز میں بچوں کی سادگی تھی۔

سلطانہ کو اس کی یہ ادا بڑی پیاری معلوم ہوئی۔ مسکرا کر بولی۔ "کیا مطلب؟"

وہ گھبرا گیا۔ "میں سمجھتا تھا کہ آپ کچھ عجیب سی ہوں گی۔"

اسی وقت شاہد کی بہن نے کہا۔ "آپ کو دیکھ کر تعجب تو مجھے بھی ہوا۔"

سلطانہ کی سمجھ میں ان کی باتوں کا مطلب نہیں آیا۔ پوچھنے لگی۔ "کیوں؟"

وہ بولی۔ "ہم تو سمجھتے تھے کہ نیاز صاحب کی مسز تو بڑی بور سی ہوں گی۔ موٹی موٹی، کالی سی۔ اور آپ اتنی زیادہ خوبصورت اور اتنی سوئٹ ہوں گی، یہ تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔" پھر وہ اپنے بھائی کو متوجہ کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں بھائی جان! یہی بات ہے نا؟"

"سچ مچ آپ بڑی گرینڈ معلوم ہوتی ہیں۔"

سلطانہ کا ایک بار پھر جی چاہا کہ وہ ان کی غلط فہمی رفع کر دے۔ مگر اس میں نیاز کی ناراضی کا ڈر تھا اور وہ اسے ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ اپنے گھر میں واپس پہنچی اور دیر تک خان بہادر کے اہل خانہ کے بارے میں سوچتی رہی۔ ملنسار بیٹیاں اور ہنس مکھ شاہد جس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔

نہ جانے کیوں اس کی باتیں سلطانہ کو بار بار یاد آتی رہیں۔

❁ ❁ ❁

رات کے کوئی آٹھ بجے اچانک شاہد آگیا۔

نیاز اس وقت موجود نہیں تھا۔ عام طور پر وہ اس وقت غیر حاضر رہتا تھا۔ سلطانہ چاہتی تو نیاز کے دوسرے ملنے جلنے والوں کی طرح اسے بھی ٹرخا دیتی۔ مگر شاہد سے ملنے وہ خود ڈرائنگ روم میں گئی۔ وہ کسی کام سے نیاز کے پاس آیا تھا۔

باتوں باتوں میں اس نے سلطانہ کو پھر مسز نیاز کہہ کر مخاطب کیا۔ سلطانہ نے سوچا کہ وہ اس غلط فہمی کو مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ اس نے مسکرا کر ٹوکا۔

"آپ مجھے مسز نیاز نہ کہا کریں۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "کیوں؟"

"میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔" سلطانہ نے شرما کر دبی زبان سے کہا۔ "شاید آپ کو پتہ نہیں۔ نیاز صاحب رشتے میں میرے سوتیلے والد لگتے ہیں۔"

شاہد تعجب سے منہ پھاڑ کر بولا۔ "ارے!" لمحہ بھر تک وہ ہکا بکا اسے تکتا رہا۔ "تو پھر اس روز آپ نے یہ بات کیوں نہ بتائی؟"

"آپ لوگوں نے بتانے کا موقع ہی کہاں دیا۔"

شاہد معذرت کرنے لگا۔ "ہم تو یہی سمجھے ہوئے تھے۔ یہ تو بہت بری بات ہو گئی۔ آپ نے برا تو نہیں مانا۔ پھر اس نے گھبرا کر خود ہی کہا۔ "آپ نے ضرور برا مانا ہو گا۔"

اسے پریشان دیکھ کر سلطانہ بولی۔ "وہ تو غلط فہمی تھی۔ اس کا کیا برا ماننا۔"

شاہد نے اس کے بعد کچھ نہ کہا۔ چپ چاپ بیٹھا سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتا رہا۔ پنکھے کی ہوا سے اس کے بال بکھر کر پیشانی پر آگئے تھے۔ چہرہ سوچتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس عالم میں وہ بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔

سلطانہ نے کئی بار اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ ہر بار وہ اسے زیادہ کشش انگیز نظر آیا۔ معصوم چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں اور بھرے بھرے گلابی ہونٹ۔

ٹرخانا: ٹال دینا۔ دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنا: کنکھیوں سے دیکھنا۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ باہر باغیچے میں درختوں کے خشک پتے آہستہ آہستہ کھڑ کھڑا رہے تھے۔ دبی دبی آہٹیں پیدا کر رہے تھے۔

رات کا اندھیرا بڑھ گیا تھا۔

سلطانہ نے اسے خاموش پا کر پوچھا۔ "آپ کیا سوچنے لگے؟"

"کچھ نہیں، بس ایسے ہی ذرا سوچ رہا تھا۔"

"کیا؟" سلطانہ نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ شاہد علی نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور بے چین ہو کر بائیں ہاتھ سے سر کے بال کریدنے لگا۔ پھر اس نے دبی زبان سے کہا۔ "میں آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"میرے بارے میں؟"

شاہد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھا۔ دروازہ پر پہنچا اور سلطانہ کی جانب دیکھے بغیر باہر چلا گیا۔ سلطانہ کچھ نہ بولی۔ گم صم بیٹھی رہی۔

دوسرے روز شام کو وہ پھر آیا۔ نیاز اس وقت بھی موجود نہ تھا۔ سلطانہ جیسے اس کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بلا جھجک پہنچ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا مگر کوئی بات نہیں کی۔ کمرے میں خاموشی تھی اور باہر شام در و دیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ پھیل رہی تھی۔ تاریک ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد شاہد کی آواز خاموشی میں ابھری۔ "میں آپ ہی سے ملنے کے لیے آیا تھا۔"

"مجھ سے؟" سلطانہ کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"یہاں تو بہت ویرانی ہے۔" شاہد نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ "آپ کا دل نہیں گھبراتا؟"

"گھبراتا تو ہے۔" اس دفعہ سلطانہ کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر شاہد کو دیکھا۔ "آپ مجھ سے ملنے کیوں آئے تھے؟"

شاہد چپ رہا۔ اس نے پہلو بدلا۔ اس کے چہرے سے بے چینی جھلک رہی تھی۔ اچانک وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی طرف مڑا۔ آگے بڑھا۔ مگر دہلیز تک پہنچتے پہنچتے ٹھٹکا۔ پلٹ کر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے دونوں کی نظریں ملیں۔ شاہد مبہوت کھڑا رہا۔ پھر کسی سحر زدہ انسان کی

مبہوت: ہکا بکا۔ سحر زدہ: جس پر جادو کیا گیا ہو۔

طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا سلطانہ کے قریب آیا۔ اس کی سانس اتنی تیز چل رہی تھی گویا ہانپ رہا ہو۔ سلطانہ بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ سلطانہ نے شاہد کی گرم گرم سانسوں کی حرارت اپنے رخساروں پر محسوس کی۔

شاہد کی آنکھوں میں چراغ جھلملا رہے تھے۔ ہونٹوں پر لرزش تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور بے اختیار سلطانہ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

سلطانہ نے کسمسا کر کئی بار اس کے بازوؤں کے حلقے سے نکلنے کی کوشش کی مگر صرف کلبلا کر رہ گئی۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ اس نے نڈھال ہو کر اپنا سر شاہد کے کندھے سے ٹکا دیا وہ موم کی طرح پگھل چکی تھی۔

کمرے کی خاموشی میں شاہد کی تیز سانسوں کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ سلطانہ اس کے پہلو میں بت بنی کھڑی تھی۔

چند لمحے بعد شاہد کی آواز ابھری۔ "میں امریکہ نہیں جاؤں گا۔ میں اب ایم بی اے نہیں کروں گا۔" وہ اپنی بے ترتیب سانس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیوں؟" سلطانہ نے مجسم سوال بن کر پوچھا۔

"میں تم کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں آج یہی کہنے آیا تھا۔" وہ ہولے ہولے سلطانہ کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ "میں پہلے تم سے شادی کروں گا۔ خدا کی قسم! میں آج ہی امی سے صاف صاف کہہ دوں گا۔ میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ بے حد جذباتی ہو گیا۔ "تم میری ہو تم میری ہو۔" اس نے پاگلوں کی طرح سلطانہ کی گردن چومنا شروع کر دی۔

❁ ❁ ❁

شاہد چلا گیا۔ سلطانہ اپنے کمرے میں گئی۔ آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر اپنا عکس دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی کیا وہ واقعی خوب صورت ہے؟ کیا وہ اس قابل ہے کہ شاہد اس سے بیاہ کر لے؟

یہ سوالات اس کے ذہن میں کلبلاتے رہے اور اس کی دلکش آنکھیں بار بار آئینے میں جھلکتی رہیں۔ ہونٹ لرز کر رہ جاتے۔ ان پر مسکراہٹ بکھر جاتی۔

وہ شام اور ایسی کئی شامیں اس نے انگڑائیاں لے لے کر اور مسکرا مسکرا کر گزار دیں۔

مگر شاہد دوبارہ نہ آیا۔

ایک روز نیاز نے باتوں باتوں میں سلطانہ کو بتایا کہ شاہد امریکہ چلا گیا۔ سلطانہ کے دل پر زور کا ناگ۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔

زندگی ایک بار پھر اسے جل دے گئی تھی۔

اس صدمے نے اسے توڑ پھوڑ کر ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔ وہ سہانے خواب، جو اس نے پچھلے کئی روز دیکھے تھے، تار عنکبوت کی مانند بکھر کر رہ گئے۔ اس کے چاروں طرف اندھیرے کا جال پھیل گیا۔ پھر زندگی کا وہی لق ودق صحرا تھا۔ وہی تنہائی وہی بے چارگی۔

(۵)

ساون کا مہینہ لگ چکا تھا۔ آسمان پر اودی اودی بدلیاں گھر گھر کر آتیں۔ مینہ برستا اور ہر ن جل تھل ہو جاتا۔ برسات کی ایک ایسی ہی رات تھی۔ پچھم سے گھٹائیں اٹھیں۔ ہوا کے تیز چلنے لگے۔ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

بارش کے موٹے موٹے قطرے کھڑکی کے شیشوں پر ٹپ ٹپ بج رہے تھے۔ ہوا کی رائیں سیٹیوں کی طرح رات کے سناٹے میں چیخ رہی تھیں۔ رات کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ نیاز بھی جاگ رہی تھی۔ اچانک بجلی غائب ہو گئی۔

جھلکتی ہوئی تمام روشنیاں اندھیرے میں ڈوب گئیں۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ ہر خوفزدہ ہو گئی۔

دیر تک سہمی ہوئی پڑی رہی۔ موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ پھر اس نے برساتی میں کار کی آواز سنی۔ نیاز واپس آ گیا تھا۔ اس کے قدموں کی آواز پختہ فرش پر سنائی دی ذرا دیر بعد کھنگارنے کی آواز ابھری۔ نیاز اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ کئی بار اس کی کھنکار خاموشی میں ابھری۔ پھر گہرا سناٹا چھایا تھا۔

کھنڈر: گرے ہوئے مکان کی اینٹیں وغیرہ۔ تار عنکبوت: مکڑی کا جالا۔ لق ودق: سنسان، ویران۔ پچھم: مغرب۔ برساتی: مراد

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ بارش برابر ہو رہی تھی۔ ہوا درختوں میں چیخ رہی تھی۔ سلطانہ ابھی تک سو نہ سکی تھی۔ بجلی واپس نہیں آئی تھی۔ اندھیرے سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔ تیز ہوا کی سرسراہٹوں میں اس نے سنا، باہر برآمدے میں کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ چاپ رک رک کر ابھر رہی تھی۔

سلطانہ لرز کر رہ گئی۔

❁ ❁ ❁

قدموں کی آہٹ رک رک کر ابھرتی رہی۔ بارش کا زور ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا۔ ہوا کے شور سے دل دہلتا تھا۔ اسی اثنا میں کمرے کے دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ۔ ڈر کے مارے سلطانہ مسہری کی پٹی سے چمٹ گئی۔ پھر ایک بھاری آواز ابھری۔ "سلطانہ۔ سلطانہ!" نیاز آہستہ آہستہ پکار رہا تھا۔

سلطانہ نے پوچھا۔ "کون؟"

نیاز نے کہا۔ "دروازہ کھولو۔"

سلطانہ دم بخود پڑی سوچتی رہی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ دروازے پر آہستہ آہستہ کھٹ کھٹ ہوتی رہی۔ نیاز رک رک کر اسے آواز دیتا رہا۔ آخر سلطانہ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

نیاز اندر آ گیا۔ ذرا دیر وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے سلطانہ سے کہا۔ "دیکھو ذرا ہوشیار سونا۔"

اس نے جلدی سے پوچھا۔ "کیوں؟"

"مجھے ابھی ابھی ایسا محسوس ہوا کہ کوئی برآمدے میں چل رہا ہے۔"

آواز سلطانہ نے بھی سنی تھی۔ وہ خوف سے لرز کر رہ گئی۔ نیاز کہتا رہا۔

"پہلے تو میں پڑا پڑا اس آہٹ کو سنتا رہا، پھر باہر نکل کے دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ اندھیرا اس قدر ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ تم نے موم بتیاں بھی منگوا کر نہیں رکھیں۔"

اس کی آواز اندھیرے میں آہستہ آہستہ ابھرتی رہی۔

خوف کے مارے سلطانہ کی آواز تک نہ نکلی۔ وہ سہمی ہوئی کھڑی رہی۔

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینا: کچھ نظر نہ آنا۔

نیاز نے پوچھا۔ "تم کو ڈر تو نہیں لگے گا؟" اور جواب کا انتظار کیے بغیر سلطانہ کا بازو تھام لیا۔
"چلو آج میرے کمرے میں سو جاؤ۔"
سلطانہ نے کسمسا کر آہستہ سے کہا۔ "نہیں۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔
نیاز نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "پاگل مت بنو، آؤ!" اور جھپاک سے اسے دونوں بازوؤں پر
نیاز اسے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے کمرے کے باہر آ گیا۔
بارش کے قطرے کھڑکی کے شیشوں پر، درختوں پر، چھتوں پر بج رہے تھے۔ ہوا فراٹے بھرتی
درختوں سے گزرتی تو ایسا محسوس ہوتا کوئی زور زور سے قہقہے لگا رہا ہے۔
اندھیرا بہت گہرا تھا اور اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں نیاز کے بوجھل قدموں کی آواز برآمدے
پختہ فرش پر آہستہ آہستہ ابھرتی رہی۔
کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ۔ آواز دور ہوتی چلی گئی۔
باہر درختوں میں کوئی پرندہ اچانک زور سے چیخا۔ پھر اس کی چیخ بارش کے شور میں ڈوب گئی۔
طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ بھیگی ہوئی سیاہ بخت رات اور سیاہ ہو گئی۔